جوگندر شمشیر

جب رالف رسل ہمارے گانو آئے

۱۹۴۹ کی گرمیوں کی ایک شام تھی۔ جب میں اور میرا ایک دوست نئی دہلی کے کناٹ سرکس میں ایک کافی ہاؤس میں گئے۔ یہ کافی ہاؤس دہلی کے دانش وروں کا مرکز سمجھا جاتا تھا۔ اخبار نویس، ادیب، باشعور طلبہ، فلاسفر، ماہرینِ سیاست، اور خُفیہ پولیس کے جاسوس، غرض یہ کہ ہر قسم کے لوگ یہاں آتے۔ خواتین بھی اور حضرات بھی۔ بحث مباحثے ہوتے اور معاشقے بھی لڑتے۔ دہلی کی ہمس آمیز گرمی میں ایرکنڈیشنڈ جگہ پر چند پل راحت میں باتیں کرنے کا ماحول ملتا۔ یہ مقام ذہنی عیاشی کا مرکز بھی سمجھی جاتی تھی۔ یہاں آئس کریم والی ٹھنڈی کافی بھی ملتی اور بھاپ چھوڑتی گرم کافی بھی۔ شام کو کافی ہاؤس خوب بھر جاتا۔ لوگ کام دھندے سے فُرصت پا کر بے فکر یہاں آتے۔ ہمیں بیٹھنے کے لیے کوئی سیٹ نہیں مِل رہی تھی۔ چار کرسیوں والی ایک میز کے گِرد دو کرسیوں پر ایک غیر ملکی مرد اور عورت بیٹھے ہوئے تھے۔ دو کرسیاں خالی تھیں۔ پہلے تو ہم نے سوچا کہ وہاں نہ بیٹھیں۔ بیچارے پریشان ہوں گے۔ ہمیں اپنی باتیں کرنی ہیں اور وہ بھی پنجابی میں۔ مگر جب کہیں اور جگہ نہ ملی تو ہم نے اُن سے جا کر پوچھ ہی لیا کہ اگر آپ محسوس نہ کریں تو ہم بھی یہاں بیٹھ جائیں۔ آپ شوق سے تشریف رکھیے۔ مرد نے جواب دیا۔ ہم نے انگریزی میں پوچھا تھا۔ اُنھوں نے نفیس اردو میں جواب دیا۔ مرد کا بولنے کا انداز گوری اردو سے قطعی مختلف تھا۔ ''تُم کیا مانگٹا ہائے'' جیسا نہیں تھا۔ اُس کے بولنے میں لکھنو اور علی گڑھ کی اردو کی چاشنی تھی۔ اس سے اُس کے اردو زبان پر عبور حاصل ہونے کی جھلک آتی تھی۔ اُس کے اردو میں باتیں کرنے سے ہماری اُن میں اور بھی دل چسپی بڑھی اور ہم اپنی باتیں چھوڑ کر اُنھیں سے باتیں کرتے رہے۔ یہ رالف رسل اور اُن کی اہلیہ محترمہ سے ہماری پہلی ملاقات تھی۔

رالف کے ساتھ پھِر میری ملاقات اُسی کناٹ پیلیس کے ایف بلاک میں پنڈت برادرز کے سامنے بر آمدے میں منروا بُک شاپ کے اسٹال پر ہوئی۔ اِس بُک اسٹال پر مارکسسٹ لٹریچر، ترقی پسند ادبی کتابیں، رسالے اور اخبارات بکتے تھے۔ میں اُن دنوں ایک زراعتی فارم کا منتظم تھا۔ یہ فارم میرے ایک دوست نے

ایڈورڈ کوینٹرز ڈیری فارم سے ٹھیکے پر لیا ہوا تھا۔ منروا بک شاپ پر ایک اور دوست نریندر سنگھ منتظم تھے۔ میں جس روز فارم کے کاموں سے جلدی فارغ ہو جاتا، یہاں آ کر نریندر کا ہاتھ بٹاتا۔ اُجڑ کر آئے شرنارتھی ہر ممکن طریقے سے اپنے پانو پر کھڑے ہونے کی کوشش کر رہے تھے۔ میرے یہ دونوں دوست ترقی پسند خیالات کے تھے۔ اِس سٹال پر بھی مختلف قسم کے لوگوں سے ملنے اور بات چیت کا موقع ملتا۔ رالف نے بھی یہاں سے چند کتابیں اور رسالے خریدے۔ مجھ سے بھی دعا سلام ہوئی۔ میں نے انھیں فارم پر آنے کی دعوت دی۔ اُنھوں نے کہا اِس دفعہ تو نہیں اگلی بار جب دہلی آئیں گے تو فارم پر بھی آئیں گے۔

چند ہفتوں کے بعد وہ علی گڑھ سے دہلی آئے تو فارم پر بھی تشریف لائے۔ شہر کے ہنگامے اور شور و غل سے دور پُرسکون سرسبز کھیتوں کے درمیان ہمارے سادہ سے گھر میں انھوں نے ہماری طرح دال بھات، ساگ سبزی اور روٹی کھانے کو ترجیح دی۔ رفع حاجت کے لئے بھی باہر کھیتوں میں گئے۔ یہ فارم دہلی کے جس علاقے میں تھا وہ رالف کے لیے نیا نہیں تھا۔ فارم کِنگز وے کیمپ سے آدھا میل آگے تھا۔ کِنگز وے کیمپ جنگ کے دنوں فوجی چھاؤنی تھی۔ یہاں ہڈسن لائنز کی فوجی بارکیں تھیں۔ رالف وہاں اپنے فوجی یُونٹ کے ہم راہ ٹھہر چُکا تھا۔ اب اُن بارکوں میں پاکستان سے آئے ہوئے پناہ گزیں رہتے تھے۔ رالف کی آمد کا پتا چلنے پر میرے کچھ اور دوست بھی فارم پر ملنے آئے۔ ان میں سردار سیوا سنگھ کوہلی جو ناردرن ریلوے کے دفتر میں کلرک تھے اور یونین کے جنرل سیکریٹری بھی تھے، سوم آنند جو اُن دنوں شاید بی۔ کام کے طالب علم تھے، اور اِسی طرح ایک اور دوست سنتو کھ سنگھ کھنُوجہ۔ سیوا سنگھ کوہلی ریلوے کلب کے سیکریٹری بھی تھے۔ اُن کی وساطت سے ہم نے دریاے جمنا میں کشتیوں میں سیر کا لطف بھی اٹھایا۔ سوم آنند جو آج کل حیدرآباد سے شائع ہونے والے اخبار ''سیاست'' میں دہلی ڈائیری کے عنوان سے ہفتہ وار کالم لکھتے ہیں اُن دنوں بھی اردو ادب پر مہارت رکھتے تھے۔ وہ اور رالف ادبی گفت گو میں بھی مصروف رہے۔ رالف کی اہلیہ محترمہ مولی اردو زبان سے ناسناشا تھیں۔ میں اور وہ انگریزی میں چھوٹی چھوٹی ذاتی باتیں کرتے رہے۔ اُس کی عمر ابھی اکیس برس کی تھی۔ اور میں بھی اُن کا ہم عمر تھا۔ ہم بہت اچھے دوست بن گئے۔

اُس روز دوپہر کا کھانا سنتو کھ سنگھ کے ہاں تھا۔ شہر کے اندرون ایک محلے میں۔ جب گلی میں داخل ہوئے تو وہاں بچے کھیل رہے تھے۔ گورے لوگوں کو دیکھ کو حیران ہوے۔ اور پھر کافی دیر ''گوری میم گلابی بچہ'' کرتے شور مچاتے رہے۔

مولی کے واپس اِنگلینڈ جانے کے بعد میری اُس سے خط و کتابت ہوتی رہی۔ یہ کوئی رومانٹک قسم کی خط و

کتابت نہیں تھی بلکہ سادہ سی نجی فکروں اور خوشیوں کی داستانیں۔ آہستہ آہستہ اِن خطوط کی تعداد بھی کم ہوتی گئی اور پھر بات ہر نئے سال کے موقع پر نیک خواہشات کے ساتھ مبارک باد کے کارڈ بھیجنے تک محدود ہوگئی۔

۱۹۵۷ کے آخر میں ۱۹۵۸ کے نئے سال کے موقع پر میرے بھیجے کارڈ کے جواب میں ۱۶؍جنوری ۱۹۵۸ کا لکھا ہوا مولی کا ایک خط آیا:

> کل رالف ایس۔ ایس۔ اسٹریتھن بحری جہاز کے ذریعہ ہندوستان کے لیے روانہ ہوگیا ہے۔ وہ غالباً فروری کے دوسرے ہفتے دہلی اور اس کے ہفتے بھر بعد علی گڑھ پہنچے گا۔ میں چاہتی تھی میں بھی اُس کے ساتھ پھر آتی اور سات سال پہلے کے دوستوں سے ملتی۔ مجھے واقعی بہت افسوس ہے کہ میں اِس بار رالف کے ساتھ آپ کو نہیں مِل پاؤں گی۔
>
> بہ راہِ مہربانی کوشش کر کے رالف سے ملیے۔ مجھے پتا ہے کہ وہ آپ سے پھر ملنا چاہتا ہے۔ ہم دونوں بہت خوشی سے آپ کے یاد کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کیوں نہ ہم اپنے ہندوستانی دوستوں سے اکثر ملیں۔ ہندوستان اِتنا دور تو نہیں۔

میں اُن دنوں رنبیر اسٹیٹ ہائی اسکول سفیدوں ضلع سنگرور میں مدرس تھا۔ یہ قصبہ ہریانہ میں جیند۔ پانی پت ریلوے لائین پر واقع ہے۔ یہاں سے دہلی کوئی بہت دُور نہیں ہے۔ میں مہینے میں ایک آدھ بار دہلی کا چکر لگا آتا تھا۔ رالف کے پہنچ جانے کے بعد میں نے اُسے علی گڑھ خط لکھا اور اُس سے ملاقات کی خواہش کا اظہار کیا۔ اُس نے جواب میں تحریر کیا کہ فُلاں تاریخ کو وہ دہلی آئے گا اور دہلی یونیورسٹی کے پروفیسر خواجہ احمد فاروقی صاحب کے ہاں کِولری لین میں ٹھہرے گا۔ میں اس سے وہاں ملوں۔ میں دہلی گیا مگر بہت مختصر سی ملاقات کا موقع ملا۔ رالف نے کہا کہ میں کچھ دنوں کے لیے علی گڑھ آؤں۔ وہاں کھُل کر باتیں کریں گے۔

کچھ وقت کے بعد میں شکروار کے روز علی گڑھ گیا۔ رالف علی گڑھ میں ڈاکٹر خورشید اسلام کے ہاں ولی منزل، بدر باغ، میں قیام پذیر تھا۔ ڈاکٹر خورشید اور اُن کی بیوی مسعودہ نے مُجھے خوش آمدید کہا اور بڑی مروت سے پیش آئے۔ میں دو راتیں علی گڑھ میں رہا۔ رالف نے مجھے یونیورسٹی بھی دِکھائی اور چند دانش ور حضرات سے بھی ملوایا۔ ہم دونوں نے علی گڑھ کی خوب سیر کی۔ اور خوب باتیں بھی۔ واپس آنے سے پہلے میں نے رالف کو دعوت دی کہ وہ اپریل کی تعطیلات میں میرے پاس میرے گاؤں آئے۔ اُس نے کہا کہ ٹھیک ہے۔ وہ ہفتے دو ہفتے کے لیے آسکتا ہے۔ پورے پروگرام کے بارے میں وہ مُجھے بعد میں لکھے گا۔ پھر ۲۳؍مارچ ۱۹۵۸

کو اپنے ایک خط میں اُسنے لکھا:

> میرے خیال میں اپریل کا دوسرا ہفتہ بہتر رہے گا۔ میں بیساکھی کا تہوار بھی دیکھنا پسند کروں گا۔ تم مجھے دہلی سے لے لو۔ اور میں جتنا ممکن ہو دیکھنا پسند کروں گا، بہ شرطے کہ ہم ایک ہفتے میں دیکھ سکیں۔ میں چندی گڑھ، بھاکڑہ ڈیم اور امرتسر بھی دیکھنا چاہوں گا۔ میں ڈاکٹر کے۔ اے۔ فاروقی کے ہاں دہلی (فون نمبر ۲۷۱۰۸) میں پہلی اپریل کی شام سے ہوں گا۔ میں تمھارے ساتھ ۸/اپریل کو دہلی سے جا سکتا ہوں۔

مُجھے بھی پہلی اپریل سے چھٹیاں ہو رہی تھیں۔ میں دو اپریل کو گیا اور فاروقی صاحب کے گھر رالف سے ملا اور اُس سے کہا کہ میں ایک ہفتہ دہلی میں نہیں ٹھہر سکتا، وہ ۷/اپریل کو رات کی گاڑی سے جالندھر آ جائے۔ میں اُسے جالندھر اسٹیشن سے لے لوں گا۔ اُس نے میرے ساتھ جا کر اپنی سیٹ ریزرو کروا دی۔ میں تین اپریل کو گانو آ گیا۔ میرا گانو موضع لکھن کے پڈہ ضلع (سابقہ ریاست) کپُورتھلا میں ہے۔ اور جالندھر سے امرتسر جانے والی جرنیلی سڑک پر سولھویں میل پر آنے والے اڈہ سُجان پُور سے دائیں جانب تین میل پر واقع ہے۔ دریاے بیاس گانو سے دو میل کے فاصلہ پر بہتا ہے۔ اُن دنوں گانو میں میری والدہ اکیلے رہتی تھیں۔ رالف کے رہنے اور سیر سپاٹے کا سارا انتظام مُجھے کرنا تھا۔ میرا پہلے آنا لازمی تھا۔

والدہ رالف کے آنے کا سن کر خوش ہوئیں۔ اِس سے گھر میں رونق ہوگی۔ اور بھی دوست ملنے آئیں گے۔ میں اور میرے ایک دوست نے رالف کو ۸/اپریل کو صبح کی گاڑی سے جالندھر اسٹیشن پہنچنے پر ساتھ لیا۔ اور بہ ذریعہ بس اپنے ایک اور دوست کے ہاں ایک گانو گئے جس نے دوپہر کے کھانے کے لیے مدعو کیا ہوا تھا۔ وہاں سے شام کو تانگے میں اپنے گانو چلے گئے۔

رالف ۱۷/اپریل تک میرے ساتھ رہا۔ اُس نے اِس دوران پنجاب کی مجموعی دیہاتی زندگی کا مشاہدہ کیا۔ کھیتی باڑی کرنے والے کسانوں سے بھی ملا۔ دلت جاتیوں کے گھروندے بھی دیکھے۔ اُسے اِس علاقے کے کئی گانو ازمنۂ وسطیٰ کے لگے۔ کچی مٹی کے گھر، بانسوں کی سیڑھیاں، مٹی کے گھڑے اور دوسرے برتن جو شاید عجائب گھروں میں ہوتے ہیں۔ مکئی کی روٹی اور سرسوں کا ساگ، دیسی گُڑ اور شکر، لسی اور تازہ مکھن، گھر کی کشید کی ہوئی دیسی شراب پی۔ وہ سب تناول کرتا رہا۔ وہ ہمارے ساتھ ہی رفع حاجت کے لئے پگ ڈنڈیوں پر چلتے چلتے کھیتوں میں جاتا۔ باہر ہی کسی کویں پر نہا آتے۔ رالف نے اِس دورے کا خوب لطف اُٹھایا۔ اُسے یارک شائر میں گزارے ہوئے اپنے بچپن کے دن یاد آتے رہے۔ اُس نے روہیل کھنڈ کے چند دیہات بھی

دیکھے ہوئے تھے۔ اُسے ہمارے گانو بھی پسند آئے۔ اردو زبان آنے کی وجہ سے عام لوگوں سے بات چیت کرنے میں بھی آسانی رہی۔ لوگ بھی اُسے دیکھنے آتے رہے۔ کچھ لوگوں نے تو شاید پہلی دفعہ کوئی انگریز دیکھا تھا۔

کپُورتھلا شہر میں خوب صورت عمارتیں اور باغات دیکھنے کے علاوہ کالج کے طلبہ سے بھی ملنے کا موقع ملا۔ سُلطان پور لودھی ایک مُتبرک اور تاریخی شہر ہے۔ یہاں گورو نانک صاحب لمبا وقت رہے تھے، اُن سے متعلقہ یہاں کئی مقام ہیں۔ مُغلیہ دور کی سرائے بھی ہے۔ اُن تمام مقامات کو بھی دیکھا۔ نزدیک سے کالی ندی گزرتی ہے۔ وہاں نہائے۔ نزدیک کے ایک گانو کے میرے ایک دوست بھی ہم راہ تھے۔ وہ آزاد ہند فوج میں کیپٹن رہے تھے۔ وہ رات گزارنے کے لیے اپنے گانو لے گئے۔

۱۳/اپریل کو بیساکھی کے روز ہم بہ ذریعہ بس امرتسر گئے۔ جو ہمارے گانو سے کوئی چالیس میل ہوگا۔ گولڈن ٹیمپل کی زیارت کی۔ جلیانوالا باغ میں شہیدوں کی یادگار دیکھی جو ۱۹۱۹ میں جنرل ڈائر کی گولیوں کا شکار ہوئے تھے۔ یہیں ایک بازار میں کمیونسٹ پارٹی کے ایک جلُوس میں رالف کی دو ممبران پارلیمینٹ ہیرن مُکرجی اور اِندرجیت گپتا سے بھی ملاقات ہوئی۔ یہ دونوں شاید رالف کے کیمبرج میں تعلیم حاصل کرنے کے وقت سے اُس سے واقف تھے۔

رات کو گانو واپس آ گئے اور اگلے تین روز مختلف دیہاتوں میں دوستوں سے ملنے جاتے رہے۔ رالف کے نفیس اُردو بولنے سے ملنے والے لوگ محظوظ ہوتے رہے۔ اور رالف بھی لطف اندوز ہوتا رہا۔ بڑا خوش گوار ماحول رہا۔ دل چسپ واقعات بھی ہوتے رہے، جیسے کپورتھلے میں ایک کالج لیکچرار دوست کے گھر چائے کے وقت اُس کی جوان بہن جو کالج میں پڑھ رہی تھی جب چائے لے کر آئی تو رالف نے میرے دوست سے کہا کہ آپ کی بہن بڑی خوب صورت ہے۔ میرے دوست کا چہرہ شرم سے کانوں تک لال ہو گیا۔ پھر بھی اس نے شکریہ ادا کیا۔ بعد میں میں نے رالف کو بتایا کہ ہماری طرف آدمی کسی کی بیوی یا بچوں کی خوب صورتی کی تعریف تو کر سکتا ہے مگر اس کی ماں، جوان بہن اور بیٹی کی نہیں۔ لوگ اسے شرم مانتے ہیں۔ رالف حیران ہوا۔

۱۷/اپریل کو رالف کی واپسی تھی۔ مجھے بھی واپس سفیدوں آنا تھا۔ ہم دونوں اِکٹھے گھر سے نکلے۔ والدہ باہر کے دروازے تک الوداع کہنے آئیں۔ اُنھوں نے رالف کو تحفے کے طور پر ایک پھُل کاری دی۔ اور یہ بھی کہا کہ پھِر بھی آنا اور بیوی بچوں کو بھی ساتھ لانا۔ ہم نے جالندھر سے ایک ہی گاڑی لی۔ میں پانی پت کے اسٹیشن پر اُتر گیا۔ اور وہ آگے دہلی چلا گیا۔ ❑